بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

دنیا میں جب کوئی تحریک کسی اخلاقی یا اجتماعی یا سیاسی مقصد کو لیکر اٹھتی ہے تو اسکی طرف وہی لوگ رجوع کرتے ہیں جنکے ذہن کو اس تحریک کے مقاصد اور اسکے اصول اپیل کرتے ہیں، جنکی طبیعتیں اس کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں، جنکے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ تحریک صحیح اور معقول ہے، اور جو اپنے نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اُس کو چلانے اور دنیا میں قائم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ اُن کے سوا باقی تمام لوگ جنکی طبیعت کی اُفتاد اُس تحریک کے مقاصد اور اصولوں سے مختلف ہوتی ہے، پہلے ہی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اُس کے دائرے میں آنے والے لائے نہیں جاتے بلکہ خود آتے ہیں۔ انہیں کوئی چیز مجبور کر کے خواہ مخواہ اُس میں داخل نہیں کر دیتی۔ نہ کوئی طاقت انہیں لاکر اس طرح اُس میں چھوڑ جاتی ہے جیسے کوئی کسی اندھے کو جنگل میں لے جاکر چھوڑ دے اور اسے کچھ پتہ نہ ہو کہ میں کہاں ہوں اور کس لیے لایا گیا ہوں۔ بلکہ وہ اسے جانچ کر، پرکھ کر، سمجھ کر پورے شعور اور کامل قصد کے ساتھ آتے ہیں۔ اور جب آجاتے ہیں تو اُس کے مقصد کو اپنا مقصد بنا کر کام کرتے ہیں کیونکہ وہی مقصد ان کے دل و دماغ کو اپیل کرتا ہے۔ اس کے اصولوں کو اپنے اصول بنا کر چلتے ہیں کیونکہ ان اصولوں کو صحیح و برحق سمجھ کر ہی وہ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے لیے اس تحریک کو چلانا زندگی کا مشن بن جاتا ہے کیونکہ جو چیز اُن سے اُن کا پچھلا مسلک و مشرب چھڑاتی ہے اور اُن کو اس نئے مسلک کی طرف کھینچ کر لاتی ہے وہ دراصل ان کے قلب و روح کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ یہی مسلک حق اور راست ہے۔ دراصل اس تحریک میں ان

پر حق منکشف ہوتا ہے۔ اس کا انکشاف ہی انکو اس تحریک کی طرف کھینچتا ہے۔ اور انکشاف حق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ آدمی کو کبھی اُس مقام پر نہیں ٹھیرنے دیتا جہاں وہ اُس انکشاف سے پہلے ہوتا ہے، بلکہ وہ اسے کشاں کشاں اُس مقام کی طرف کھینچ لے جاتا ہے جدھر حق کی روشنی اسے نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ کسی تحریک کی صداقت کے معترف ہو کر اسے قبول کرتے ہیں انکی زندگیوں کا رنگ بدل جاتا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہو جاتے ہیں۔ ان سے ایسی باتوں کا ظہور ہوتا ہے جن کی توقع عام حالات میں انسان سے نہیں کی جاتی۔ وہ اپنے اصولوں کی خاطر دوستیوں اور خونی و قلبی رشتوں تک کو قربان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے کاروبار، اپنی پوزیشن، اپنے منافع اور اپنی ہر چیز کا نقصان گوارا کرتے ہیں، حتیٰ کہ قید و بند کی تکالیف اور موت کے خطرات تک سہنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ایسا ہمہ گیر ہوتا ہے کہ ان کی عادات بدل جاتی ہیں، انکے خصائل میں تغیر آجاتا ہے، یہاں تک کہ ان کے لباس، خوراک اور عام طرز زندگی پر بھی اس کے اثرات ایسے نمایاں ہوتے ہیں کہ گرد و پیش کے لوگوں میں وہ اپنی ہر ادا سے الگ پہچان لیے جاتے ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ وہ جا رہے ہیں فلاں تحریک کے حامی۔

ہر تحریک کی ابتدا یوں ہی ہوتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں سے وہ جماعت بنتی ہے جو اسے چلانے کے لیے اٹھتی ہے۔ اس کے مقاصد اور اس کے اصول خود ہی آدمیوں کی اُس بھیڑ میں سے، جو دنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، اپنے مطلب کے آدمی چھانٹتے ہیں، اور صرف انہی لوگوں کو اس تحریک کے دائرے میں لاتے ہیں جنہیں اس سے مناسبت ہوتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرا دور آتا ہے۔ جو لوگ اس تحریک میں شامل ہوتے ہیں انکی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ انکی اولاد بھی اسی مسلک پر اٹھے جسکو خود انہوں نے حق پا کر قبول کیا ہے۔ اس غرض کے لیے وہ اپنی نئی نسلوں پر تعلیم، تربیت، گھر کی زندگی اور باہر کے ماحول سے اس قسم کے اثرات ڈالنے کی کوشش

کرتے ہیں کہ انکے خیالات، اخلاق، عادات اور خصائل سب کے سب اس مسلک کی روح اور اسکے اصولوں کے مطابق ڈھل جائیں۔ اس میں انہیں ایک حد تک کامیابی ہوتی ہے، مگر بس ایک حد تک ہی ہوتی ہے پوری کامیابی ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تعلیم و تربیت اور سوسائٹی کے ماحول اور خاندانی روایات کو طبائع کے ڈھالنے میں بہت کچھ دخل حاصل ہے، مگر فطرت، دماغ کی ساخت، مزاج کی پیدائشی افتاد بھی ایک اہم چیز ہے، اور حقیقت میں دیکھا جائے تو بنیادی چیز یہی ہے۔ فطری طور پر دنیا میں ہر قسم کے آدمی ہر مزاج، ہر رجحان، ہر ساخت کے آدمی ہمیشہ پیدا ہوتے ہیں۔ جسطرح اس تحریک کے ظہور کے وقت ہر طرح کے آدمی دنیا میں موجود تھے، اور اُن سب نے اُسکو قبول نہیں کر لیا تھا بلکہ صرف وہی اس کی طرف کھنچے تھے جو اس سے ذہنی مناسبت رکھتے تھے، اسی طرح بعد میں بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ سب لوگ جو اس تحریک کے حامیوں کی نسل سے پیدا ہونگے اُنہیں لامحالہ اس تحریک سے مناسبت ہی ہوگی۔ اُن میں ابوجہل اور ابولہب بھی ہونگے عمرؓ اور خالدؓ بھی ہونگے۔ اور ابوبکرؓ بھی ہونگے۔ جسطرح آزر کے گھر میں ابراہیم حنیف پیدا ہوسکتا ہے اُسی طرح نوحؑ کے گھر میں عمل غیر صالح بھی پیدا ہوسکتا ہے اور ہوا ہے۔ قانون فطرت کے مطابق یہ لازمی امر ہے کہ اس سوسائٹی سے باہر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اپنے مزاج کی افتاد اور اپنے پیدائشی رجحان کے لحاظ سے اسکے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور خود اسکے اندر بہت سے آدمی ایسے پیدا ہوں جو اسکے ساتھ کوئی مناسبت نہ رکھتے ہوں۔ پس یہ ضروری نہیں کہ تعلیم و تربیت کا وہ نظام جو تحریک کے ابتدائی حامی اپنی آئندہ نسلوں کے لیے قائم کرتے ہیں وہ انکی پوری نئی پود کو انکے مسلک کا حقیقی متبع بنادے۔

اس خطرے کے سدِباب، اور تحریک کو اس کے بنیادی اصولوں پر برقرار رکھنے کے لیے دو صورتیں اختیار کی جاتی ہیں:

ایک یہ کہ جو لوگ تعلیم و تربیت اور اجتماعی ماحول کی تاثیرات کے باوجود ناکارہ نکلیں ان کو جماعت سے

خارج کردیا جائے، اور اس طرح جماعت کو غیر مناسب عناصر سے پاک کیا جاتا رہے۔

دوسرے یہ کہ تبلیغ کے ذریعہ سے جماعت میں اُن نئے لوگوں کی بھرتی کا سلسلہ جاری رہے جو رجحان و ذہنیت کے اعتبار سے اس تحریک کے ساتھ مناسبت رکھتے ہوں، اور جن کو اس کے اصول و مقاصد اسی طرح اپیل کریں جس طرح ابتدائی پیرووں کو انہوں نے اپیل کیا تھا۔

یہ اور صرف یہی دو صورتیں ایسی ہیں جو کسی تحریک کو زوال سے اور کسی جماعت یا پارٹی کو انحطاط سے بچا سکتی ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ رفتہ رفتہ لوگ ان دونوں تدبیروں کی اہمیت سے غافل ہوتے جاتے ہیں۔ جماعت کے باہر سے نئے لوگوں کو اندر لانے کی کوشش کم ہونے لگتی ہے۔ جماعت کی افزائش کے لیے تمام تر نسلی افزائش ہی پر اعتماد کر لیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ اس طرح جماعت کے اندر پیدا ہوتے ہیں ان میں سے ناکارہ لوگوں کو خارج کرنے میں خونی رشتوں اور معاشرتی تعلقات اور دنیوی مصلحتوں کی خاطر تساہل برتا جاتا ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے جماعتی مسلک میں ایسی گنجائشیں نکالی جاتی ہیں کہ ہر قسم کے رطب و یابس اُس میں سما سکیں۔ اور اس مسلک کو اتنا وسیع کر دیا جاتا ہے کہ سرے سے اس کے سرحدی نشانات اور امتیازی حدود باقی ہی نہیں رہتے۔ یہاں تک کہ بھانت بھانت کے آدمی اس جماعت کے دائرے میں جمع ہو جاتے ہیں جن کو کسی قسم کی مناسبت اس کے مسلک سے، اس کے اصولوں سے اور اس کے مقاصد سے نہیں ہوتی۔

پھر جب جماعت میں اسکے اصولوں سے حقیقی مناسبت رکھنے والے کم اور مناسبت نہ رکھنے والے زیادہ ہو جاتے ہیں تو اجتماعی ماحول اور تعلیم و تربیت کا نظام بھی بگڑنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل پہلے کی نسل سے بدتر اٹھتی ہے۔ جماعت کا قدم روز بروز تنزل و انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اُس مسلک کا اور اُن اصول و مقاصد کا تصور بالکل ہی ناپید

ہو جاتا ہے جن پر ابتدا میں وہ جماعت بنی تھی۔ اس مقام پر پہنچ کر حقیقت میں جماعت ختم ہو جاتی ہے اور محض ایک نسلی اور معاشرتی قومیت اسکی جگہ لے لیتی ہے۔ وہ نام جو ابتدا میں ایک تحریک کے علمبرداروں کے لیے بولا جاتا تھا، اسکو وہ لوگ استعمال کرنے لگتے ہیں جو اس تحریک کو مٹانے والے اور اسکے جھنڈے کو سرنگوں کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ نام جو ایک مقصد اور ایک اصول کے ساتھ وابستہ تھا، وہ باپ سے بیٹے کو ورثہ میں ملنے لگتا ہے بلا لحاظ اسکے کہ صاحب زادے کی زندگی کے اصول اور مقاصد اس نام سے کوئی دور کی مناسبت بھی نہ رکھتے ہوں۔ درحقیقت ان لوگوں کے ہاتھ میں پہنچ کر وہ نام اپنی معنویت کھو دیتا ہے۔ وہ خود بھول جاتے ہیں اور دنیا بھی بھول جاتی ہے کہ یہ نام کسی مقصد، کسی مسلک، کسی اصول کے ساتھ وابستہ ہے۔ بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔

اسلام اس وقت اسی آخری مرحلہ میں پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کے نام سے جو قوم اس وقت موجود ہے وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گئی ہے، اور اسکے طرزِ عمل نے دنیا کو بھی یہ بات بھلا دی ہے کہ اسلام اصل میں ایک تحریک کا نام ہے جو دنیا میں ایک مقصد اور ایک اصول کو لے کر اٹھی تھی، اور مسلمان کا لفظ اُس جماعت کے لیے وضع کیا گیا تھا جو اس تحریک کی پیروی اور اسکی علمبرداری کے لیے بنائی گئی تھی۔ تحریک گم ہو گئی اسکا مقصد فراموش کر دیا گیا۔ اسکے اصولوں کو ایک ایک کر کے توڑ ڈالا گیا۔ اور اس کا نام اپنی تمام معنویت کھو دینے کے بعد اب محض ایک نسلی و معاشرتی قومیت کے نام کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے۔ حد یہ ہے کہ اسے ان مواقع پر بھی بے تکلف استعمال کیا جاتا ہے جہاں اسلام کا مقصد پامال ہوتا ہے، جہاں اس کے اصول توڑے جاتے ہیں، جہاں اسلام کے بجائے غیر اسلام ہوتا ہے۔

بازاروں میں جائیے "مسلمان رنڈیاں" آپ کو کوٹھوں پر بیٹھی نظر آئینگی اور "مسلمان زانی"

گشت لگاتے ملینگے - جیلخانوں کا معائنہ کیجیے "مسلمان چوروں" "مسلمان ڈاکوؤں"، اور "مسلمان بدمعاشوں" سے آپ کا تعارف ہوگا - دفتروں اور عدالتوں کے چکر لگائیے - رشوت خواری، جھوٹی شہادت، جعل، فریب، ظلم اور ہر قسم کے اخلاقی جرائم کے ساتھ آپ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگا ہوا پائینگے سوسائیٹی میں پھریے - کہیں آپ کی ملاقات "مسلمان شرابیوں" سے ہوگی- کہیں آپ کو "مسلمان قمار باز" ملینگے- کہیں "مسلمان سازندوں" اور "مسلمان گویّوں" اور "مسلمان بھانڈوں" سے آپ دوچار ہونگے بھلا غور تو کیجیے یہ لفظ مسلمان کتنا ذلیل کردیا گیا ہے اور کن کن صفات کے ساتھ جمع ہو رہا ہے؟ مسلمان اور زانی! مسلمان اور چور! مسلمان اور شرابی! مسلمان اور قمار باز! مسلمان اور رشوت خوار! اگر وہ سب کچھ جو ایک کافر کرسکتا ہے وہی ایک مسلمان بھی کرنے لگے تو پھر مسلمان کے وجود کی دنیا میں حاجت ہی کیا ہے؟ اسلام تو نام ہی اس تحریک کا تھا جو دنیا سے ساری بد اخلاقیوں کو مٹانے کے لیے اٹھی تھی - اس نے تو مسلمان کے نام سے اُن چیدہ آدمیوں کی جماعت بنائی تھی جو خود بلند ترین اخلاق کے حامل ہوں اور اصلاح اخلاق کے علمبردار بنیں- اس نے اپنی جماعت میں ہاتھ کاٹنے کی، پتھر مار مار کر ہلاک کردینے کی، کوڑے برسا برسا کر کھال اڑا دینے کی، حتیٰ کہ سولی پر چڑھا دینے کی ہولناک سزائیں اسی لیے تو مقرر کی تھیں کہ جو جماعت دنیا سے زنا کو مٹانے اٹھی ہے خود اس میں کوئی زانی نہ پایا جائے، جس کا کام شراب کا استیصال ہے وہ خود شراب خواروں کے وجود سے خالی ہو، جسے چوری اور ڈاکہ کا خاتمہ کرنا ہے خود اس میں کوئی چور اور ڈاکو نہ ہو- اس کا تو مقصد ہی یہ تھا کہ جنہیں دنیا کی اصلاح کرنی ہے وہ دنیا بھر سے زیادہ نیک سیرت، عالی مرتبہ اور باوقار لوگ ہوں - اسی لیے قمار بازی، جعلسازی، اور رشوت خواری تو درکنار اس نے اتنا بھی گوارا نہ کیا کہ کوئی مسلمان سازندہ اور گوّیا ہو، کیونکہ مصلحین اخلاق کے مرتبہ سے یہ بھی گری ہوئی چیز ہے - جس اسلام نے ایسی سخت قیود اور اتنے شدید ڈسپلن کے ساتھ اپنی تحریک اٹھائی تھی، اور جس نے اپنی جماعت میں چھانٹ چھانٹ کر بلند ترین کیرکٹر کے آدمیوں کو بھرتی کیا تھا، اسکی رسوائی اس سے بڑھ کر

اور کیا ہو سکتی ہے کہ رنڈی اور بھڑوے اور زانی اور چور تک کے ساتھ لفظ "مسلمان" کا جوڑ لگ جائے؟ کیا اس قدر ذلیل اور رسوا ہو جانے کے بعد بھی "اسلام" اور "مسلمان" کی یہ وقعت باقی رہ سکتی ہے کہ سر اسکے آگے عقیدت سے جھک جائیں اور آنکھیں اسکے لیے فرشِ راہ بنیں؟ جو شخص بازار بازار اور گلی گلی خوار ہو رہا ہو کیا کبھی اسکے لیے بھی آپ نے کسی کو ادب سے کھڑے ہوتے دیکھا ہے؟

یہ تو بہت ذلیل طبقہ کی مثال تھی۔ ذرا اونچے تعلیم یافتہ طبقہ کو دیکھیے کہ یہاں اسلام کی نمائندگی کس شان سے ہو رہی ہے۔

آج اپنے اخباروں اور رسالوں میں، اپنے جلسوں اور انجمنوں میں، اور اپنے پڑھے لکھے طبقہ میں آپ ہر طرف کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں غیر اسلامی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر مشتمل ہوں۔ من لم یحکم بما انزل اللہ میں کم سے کم اتنے فی صدی ہم بھی ہوں۔ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت میں غالب حصہ ہمارا ہی رہے۔ اسی کی ساری چیخ پکار ہے۔ اسی کا نام اسلامی مفاد ہے۔ اسی محور پر آپ کی قومی سیاست گھوم رہی ہے۔ یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی پالیسی کو کنٹرول کر رہا ہے۔

اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو کیا اس کا یہی نقطۂ نظر ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو، کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیرووں کو کل پرزے بننے کی اجازت دے سکتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو؟ یا فاشست گرانڈ کونسل میں اپنی نمائندگی کے مسئلہ پر اشتراکیت کے بقاء و فنا کا انحصار رکھا ہو؟ اگر آج

روسی کمیونسٹ پارٹی کا کوئی ممبر نازی حکومت کا وفادار خادم بن جائے تو کیا آپ توقع رکھتے ہیں کہ اسے ایک لمحہ کے لیے بھی پارٹی میں رہنے دیا جائیگا؟ اور اگر کہیں وہ نازی آرمی میں داخل ہو کر نازیت کو سربلند کرنے کی کوشش کرنے لگے تو کیا آپ اس کی جان کی سلامتی کی بھی امید کر سکتے ہیں؟ مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ اسلام جس روٹی کو زبان پر رکھنے کی اجازت بھی شائد انتہائی اضطرار کی حالت میں دیتا، اور جسکو حلق سے اتارنے کے لیے غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط لگاتا، اور پھر تاکید کرتا کہ جس طرح سخت بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے سور کھایا جا سکتا ہے اُسی طرح بس یہ روٹی بھی بقدرِ سدِ رمق کھالو، یہاں اس روٹی کو نہ صرف ھنیاً مریاً کر کے پورے انبساط کے ساتھ کھایا جاتا ہے، بلکہ اسی پر کفر و اسلام کے معرکے سر ہوتے ہیں، اور اسی کو اسلامی مفاد کا مرکزی نقطہ قرار دیا جاتا ہے! اس کے بعد تعجب نہ کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اور ایک مصلح تمدن کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو سن کر دنیا مذاق اڑانے لگے۔ کیونکہ اسلام کی نمائندگی کرنے والوں نے خود اسکے وقار کو اور اسکے دعوے کو اپنے معبودِ شکم کے چرنوں میں بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

اور دیکھیے۔ آپکے ہاں ایک صاحب بڑے طنطنہ کے ساتھ ایک فوجی تحریک لے کر اٹھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ تمہاری شوکت رفتہ کو پھر تازہ کرونگا اور تمہیں زمین میں غلبہ دلوا کر چھوڑونگا۔ آپکے ہزاروں نہیں لاکھوں آدمی انکی طرف دوڑتے ہیں۔ لاکھوں ان سے فلاح و کامرانی کی آس لگاتے ہیں۔ آپکا پریس اِدھر سے اُدھر تک انکی حمایت کرتا ہے۔ اور دیکھتے دیکھتے یہ صاحب اسلام کے سپہ سالار اور ملت کے امیر مطاع بن جاتے ہیں۔ مگر آپ میں سے بہت کم لوگوں کو یہ خیال آتا ہے کہ انکے عقائد، انکے فہم قرآن، ان کے اخلاق، انکی گفتار، انکے اعمال، اور ان کے طریق کار کا بھی جائزہ لے کر دیکھیں۔ ایک شخص علانیہ جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ پر اپنی تحریک کی پوری عمارت کھڑی کرتا ہے، غیر مسلموں تک کے سامنے اپنے

کذب و دروغ سے اسلام اور مسلمانوں کو رسوا کرتا ہے، اپنی بدزبانی اور لاف زنی سے مسلمانوں کے قومی اخلاق کی تذلیل و تضحیک کرتا ہے، غیر مسلموں کے مقابلہ پر آکر پہلی ضرب کھاتے ہی معافی مانگتا ہے، پھر اپنے وقار کو بچانے کے لیے علی الاعلان جھوٹ بولتا ہے کہ میں نے معافی نہیں مانگی، اور پھر لاف زنی کرتا ہوا وہیں لڑنے پہنچ جاتا ہے جہاں اس نے واپس نہ جانے کا عہد کیا تھا۔ تم یہ سب کچھ دیکھتے ہو اور اسکے باوجود اسکے پیچھے لگے رہتے ہو محض اس امید میں کہ یہ ہمیں دنیوی کامرانیوں سے ہمکنار کر دیگا۔ ایک شخص کی تحریر و تقریر اور ایک ایک حرکت سے دنائت، سفلہ پن اور بازاریت ٹپکی پڑتی ہے، تقویٰ، صداقت، اور وقار کا نام و نشان تک نظر نہیں آتا اور تم اسکی امارت تسلیم کرنے میں ذرا تامل نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ وہ پچاس ہزار مسلمانوں کی جانیں غیر مسلم حکومت کی خدمت کے لیے پیش کرتا ہے اور اس خدمت گذاری کا فائدہ تمہیں یہ بتاتا ہے کہ اس بہانے تم کو عسکری ٹریننگ مل جائیگی اور تمہاری فوجی پوزیشن مضبوط ہو جائیگی۔ تم اس ذلیل تدبیر کی خوراک بھی حلق سے نیچے اتار لیتے ہو اور خوش ہوتے ہو کہ ہمیں ایک فوجی تنظیم کرنے والا امیر تو مل گیا۔

یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ تمہارا معیار اخلاق و انسانیت کس قدر گر گیا ہے۔ تم جس اسلام کی نمائندگی کا دعویٰ کرتے ہو وہ دنیا میں یہ اصول قائم کرنے آیا تھا کہ انسان کا مقصد ہی صرف پاک نہ ہونا چاہیے بلکہ اسکو حاصل کرنے کے ذرائع بھی پاک ہونے چاہییں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ جس ذریعہ سے بھی تم کو کامیابی کے حصول کی امید نظر آتی ہے، خواہ وہ کتنا ہی ناپاک اور ذلیل ذریعہ کیوں نہ ہو، تم دوڑ کر اسے دانتوں سے پکڑ لیتے ہو اور جو تمہیں اس سے روکنا چاہے الٹا اسی کو کاٹ کھانے پر آمادہ ہو جاتے ہو۔ ذرائع کی پاکی و ناپاکی سے قطع نظر کر کے محض کامیابی کو مقصود بالذات بنانا تو دہریوں اور کافروں کا شیوہ ہے۔ اگر مسلمان نے بھی یہی کام کیا تو اسکی خصوصیت کیا باقی رہی؟ بلکہ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد دوسری جاہل قوموں سے الگ، "مسلمان" کے جداگانہ وجود کے لیے کونسی وجہ جواز رہ جاتی ہے؟

اور اوپر چلیے - آپ کی سب سے بڑی قومی مجلس "مسلم لیگ"، جسکو آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ ہے، ذرا اس کو دیکھیے کہ اِس آزمائش کی گھڑی میں وہ کس روش کا اظہار کر رہی ہے؟ حال میں اس نے جنگ کے متعلق جو ریزولیوشن پاس کیا ہے اور پھر وائسرائے کے اعلان پر جس رائے کا اظہار کیا ہے اُس کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے - اگر آپ ایک اصول پرست جماعت کے طرزِ عمل، اور ایک ایسی جماعت کے طرزِ عمل میں جو محض اپنی قوم کی سیاسی اغراض کی خدمت کے لیے بنی ہو، فرق و امتیاز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، تو اوّل نظر میں آپ کو محسوس ہو جائیگا کہ جنگ کے موقع پر جو پالیسی لیگ نے اختیار کی ہے وہ اصول پرستی کے ہر نشان سے خالی ہے - اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ درحقیقت یہی پالیسی مسلمانوں کے ذہن کی ترجمانی کرتی ہے، تو اِس کے آئینہ میں ہر صاحب نظر آدمی دیکھ سکتا ہے کہ ان نام نہاد مسلمانوں پر پوری طرح اخلاقی موت وارد ہو چکی ہے - مقامی طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی جو سیاسی پوزیشن اس وقت ہے، اِس پوزیشن میں اگر دنیا کی کوئی اور قوم ہوتی تو اس کی لیگ بھی ایسی ہی پالیسی اختیار کرتی، اور قریب قریب انہی الفاظ میں اپنا ریزولیوشن مرتب کرتی - آپ مسلم کے بجائے، سکھ، پارسی، جرمن، اٹالین، جو نام چاہیں رکھ سکتے ہیں - یہی سیاسی موقف اور یہی مقامی حالات اُس کے ساتھ وابستہ کر دیجیے، اور پھر بڑی آسانی کے ساتھ آپ اس ریزولیوشن کو ان میں سے ہر قوم کی طرف منسوب کر سکتے ہیں - اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان اب اُسی سطح تک گر گیا ہے جس سطح پر دنیا کی دوسری تمام قومیں ہیں - ایک موقع و محل پر دنیا کی کوئی کافر و مشرک قوم جو طرزِ عمل اختیار کر سکتی ہے وہی مسلمان بھی اختیار کر رہا ہے - وہ بالکل بھول گیا ہے کہ میں اوّلاً اور بالذات ایک اخلاقی اصول کا نمائندہ اور وکیل ہوں، اِسی حیثیت سے میرا نام مسلمان ہے، میرا کام سب سے پہلے ایک معاملہ کے اخلاقی پہلو کو دیکھنا ہے، اور میری مسلمان ہونے کی حیثیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسی پہلو پر اپنے فیصلہ کا مدار رکھوں - اگر میں نے بھی صرف یہی دیکھا کہ پیش آمدہ معاملہ خود مجھ پر اور میری

(بقیہ مضمون صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ ہو)